مولانا عبدالرحمان صاحب کیلانی

بنک کا سُود

سُود ایک ایسا گناہ ہے جس کی حُرمت سے کوئی مسلمان انکار نہیں کرسکتا۔ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (پارہ ۳۔ آیت ۲۷۹-۲۷۸)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو۔ اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جو سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے۔ تو اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ؟ مطلب واضح ہے کہ جو سُود خوار ہے وہ مسلمان نہیں اور جو مسلمان ہے وہ سُود خوار نہیں ہو سکتا۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلرِّبٰوا سَبْعُوْنَ جُزْءًا اَیْسَرُھَا اَنْ یَّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ۔ (ابن ماجہ بیہقی)

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سُود کے اگر ستر حصے کیے جائیں تو اس کا کمزور حصہ بھی (گناہ میں) اپنی ماں سے زنا کے برابر ہے۔

پھر اس کی حُرمت اور گناہ کی شدت کا اندازہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک سے بھی لگا لیجئے:۔

عَنْ جَابِرٍ قَالَ: لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اٰکِلَ الرِّبٰوا وَمُوْکِلَہٗ وَکَاتِبَہٗ وَشَاھِدَیْہِ وَقَالَ ھُمْ سَوَآءٌ۔ (مسلم)

حضرت جابر رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سُود لینے والے، دینے والے، اس کی دستاویز لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی اور فرمایا یہ کہ سب لوگ (گناہ میں) برابر کے شریک ہیں

پھر یہ تصریح بھی فرما دی کہ جس معاملے میں سُود کا شائبہ تک بھی موجود ہو اسے چھوڑ دیا جائے۔ ایسے شدید احکام کے بعد ایک مسلمان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ سُود اور اس کی تمام مشتبہ شکلوں سے

پرہیز کرے۔

بنک انٹرسٹ اور کمرشل انٹرسٹ

سُود فارسی زبان کا لفظ ہے اور اس کی ضد فارسی میں "زیان" ہے۔ "سود و زیان" نفع و نقصان کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی سُود بمعنی فائدہ یا نفع ہے۔ اور یہ لفظ اُردو میں بھی مستعمل ہے۔ عربی میں اس کے لیے رِبٰوا اور انگریزی میں انٹرسٹ (INTEREST) کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔
کمرشل انٹرسٹ بمعنی تجارتی سود ہے مثلاً زید، بکر سے دس ہزار روپے لے کر کاروبار کرتا ہے۔ اور اس کے عوض وہ اسے مقررہ شرح سے نفع دینا طے کرتا ہے۔ تو یہ تجارتی سُود یا کمرشل انٹرسٹ ہے۔ اور اگر یہی کام کسی فرد یا ادارہ کے بجائے بنک کرتا ہے۔ تو بنک انٹرسٹ کہلاتا ہے اسے کمرشل انٹرسٹ بھی کہہ دیتے ہیں۔

گو ہم نے اوپر نہایت اختصار سے سُود کی حرمت کے متعلق صرف ایک آیت اور حضور اکرمؐ کے ایک دو ارشاد مبارک درج کیے ہیں۔ تاہم یہ سُود کی حُرمت ثابت کرنے کے لیے بہت ہیں۔ اور نیز یہ ثابت کرنے کے لیے بھی کافی ہیں کہ قرآن میں ربٰوا کا لفظ علی الاطلاق استعمال ہوا ہے جس سے سُود کی کوئی بھی قسم مستثنیٰ قرار نہیں دی جا سکتی۔ لیکن اتنے واضح اور سخت احکام کے باوجود مسلمانوں میں سے ایک طبقہ تجارتی سُود کی اباحت کے لیے کئی طرح کے حیلے بہانے تلاش کر کے دلائل پیش کر رہا ہے۔ آج ہم انہیں دلائل کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

کہا یہ جاتا ہے کہ "ربا" ایسے سُود کا نام ہے جو کوئی مقروض اپنی بھوک اور احتیاج دور کرنے کی غرض سے کسی مہاجن یا ساہوکار سے قرض لیتا ہے اور سُود خوار اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر بھاری شرح سُود پر معاملہ کر کے اس پر ظلم کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایسے ہی شخص احتیاج کے قرض پر سود کو "ربا" کہا جاتا تھا۔ جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔ رہا تجارتی سُود تو عہدِ نبوی میں ایسے تجارتی قرضوں کا رواج ہی نہ تھا۔ عرب میں طوائف الملوکی، لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں عام ہوتی تھیں، وسائل سفر انتہائی محدود تھے۔ لہٰذا تجارت بھی برائے نام ہوتی تھی۔ اور جب تجارت ہی برائے نام ہو تو تجارتی قرضوں اور تجارتی سُود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ ہی [illegible] کا وجود ثابت ہوتا ہے اندریں حالات دورِ حاضر کا بنک کا سُود اس ربا کی تعریف میں کیونکر آ سکتا ہے۔ جسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔

مہاجنی سُود اور بنک کے سُود میں امتیازی فرق سمجھنے کے لیے عموماً درج ذیل نکات پیش کیے جاتے ہیں

یا بالفاظِ دیگر اس کی اباحت کے لیے درجِ ذیل دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ مہاجنی قرضہ میں مقروض خود مہاجن کے پاس جا کر قرضہ کی درخواست کرتا ہے جبکہ بنک انٹرسٹ کی صورت میں قرض دینے والا خود بنک کے پاس جا کر اپنی رقم پیش کرتا ہے، کہ اسے کاروبار میں لگائے اور منافع میں سے اسے بھی "کچھ" دے دے۔ بنک اس قرض دہندہ کو ایک پہلے سے طے شدہ شرحِ سُود ادا کرتا ہے۔

۲۔ صنعت کار یا تاجر جو بنک سے قرضہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ بسا اوقات بنک کو خود شرحِ سُود کی پیشکش کرتا ہے۔ بنک کے اس لین دین میں کسی فریق کی مجبوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب کام باہمی رضامندی سے طے پاتے ہیں۔

۳۔ مہاجنی قرضہ میں شرحِ سُود اتنی بلند ہوتی ہے کہ ایک ضرورت مند مفلس اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جبکہ تجارتی سود پر تجارت میں نقصان کے احتمال کو سامنے رکھ کر مناسب شرحِ سُود مقرر کی جاتی ہے۔ جو نقصان کی صورت میں بھی قابلِ برداشت ہوتی ہے۔ لہذا بنک انٹرسٹ میں مقروض پر کچھ ظلم نہیں ہوتا۔

۴۔ مہاجنی قرضے کی صورت میں مہاجن کو بعض دفعہ سُود تو بجائے خود رہا، اصل بھی وصول نہیں ہوتا۔ جبکہ بنک انٹرسٹ میں بنک اپنے مفادات کا پورا تحفظ کر لیتا ہے۔ بنک زیورات، جنس، خام مال، دیگر اشیاء بطورِ زرِ رہن رکھ کر اس کا [illegible] فیصد تک قرضہ دیتا ہے۔ اس طرح بنک بھی نقصان سے محفوظ رہتا اور ظلم سے بچ جاتا ہے۔ رہے نادار لوگ تو بنک انہیں قرضہ دینے سے یکسر انکار کر دیتا ہے۔

۵۔ مہاجنی قرضہ میں نقصان کا پہلو نفع کی نسبت فی الواقع زیادہ ہے۔ کیونکہ اس میں ایک نادار پر ظلم ہوتا ہے۔ جبکہ بنک انٹرسٹ کی صورت میں فریقین سے ہر ایک کے لیے فائدہ تو یقینی ہے اور نقصان کا احتمال بہت کم رہ جاتا ہے۔ لہذا قرآن کریم کے اس اصول وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا۔ (شراب اور جوئے سے متعلق) کے مطابق بھی بنک انٹرسٹ کو اس "ربا" سے مستثنیٰ قرار دیا جانا چاہیے جسے حرام قرار دیا گیا ہے۔

اور اس "استثناء" کی ضرورت یا اضطرار یہ بیان کیا جاتا ہے کہ موجودہ دور میں تمام تر ملکی و غیر ملکی تجارت کا انحصار بنک کے سُود پر ہے۔ لہذا عصرِ حاضر کا تقاضا یہ ہے کہ مندرجہ بالا وجوہات کے پیشِ نظر ربا کے قواعد میں اجتہاد کر کے مناسب ترمیم کی جانی چاہیے تاکہ اسلام ہر زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے

والا نظام ثابت ہو سکے۔

یہ ہیں وہ دلائل جن کے پیش نظر "ربا" کی تعریف میں مناسب ترمیم اور اجتہاد کی سفارش کی جاتی ہے، اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو مذکورہ بالا دلائل میں مندرجہ ذیل تنقیح طلب امور سامنے آتے ہیں۔

۱۔ کیا عہدِ نبوی میں عرب میں فی الواقع تجارت نہایت محدود تھی۔
۲۔ ان ایام میں تجارتی قرضوں یا تجارتی سود کا وجود ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟
۳۔ کیا شرحِ سود کی کمی یا مناسب شرح حرمتِ سود پر اثر انداز ہو سکتی ہے، کہ اسے اباحت کے قریب لے آئے؟
۴۔ کیا فریقین کی رضامندی سود کو جائز بنا سکتی ہے؟
۵۔ کیا فی الواقع حرمتِ سود کی علت "ظلم" ہی ہے؟ اگر فریقین میں سے کسی پر بھی ظلم کا احتمال نہ ہو تو سود کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟
۶۔ عصرِ حاضر کے تقاضوں کے تحت سود کی تعریف میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے، جبکہ اس کا نفع نقصان سے زیادہ ہے؟۔

اب ہم ان تنقیحات کو علی الترتیب زیرِ بحث لائیں گے۔

۱۔ عہدِ نبوی میں تجارت

عرب ایک بے آب و گیاہ ملک ہے جس کا بہت تھوڑا رقبہ کاشت کے قابل ہے۔ اور جو کاشت کے قابل ہے اس پر بھی کم ہی توجہ دی جاتی تھی۔ کیونکہ شرفائے عرب زراعت کو کوئی معزز پیشہ تصور نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح ہاتھ سے کام کرنے یا دست کاری کے کام کو بھی باعثِ عار سمجھتے تھے۔ عرب میں عام لوگوں کا پیشہ تو بھیڑ، بکریاں، گائے اور اونٹ پالنا تھا اور شرفائے عرب کا محبوب مشغلہ تجارت ہی تھا۔ البتہ یمن میں اون کاتنے، چادریں اور کمبل بُننے کا کام بھی ہوتا تھا۔ عربوں کو چونکہ فنونِ سپہ گری سے گہری دلچسپی تھی لہٰذا کہیں کہیں آلاتِ جنگ بھی تیار کیے جاتے تھے۔

نتیجۃً اہلِ عرب کو اشیائے خورد و نوش اور دیگر ضروریات کا سامان باہر سے درآمد کرنا پڑتا تھا۔ بلاشبہ ان دنوں لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا دور دورہ تھا اور کسی راستے ڈستے مسافر کا جان و مال محفوظ نہ تھا۔ مگر یہ تجارت عموماً قافلوں کی شکل میں ہوا کرتی تھی۔ قریشِ مکہ کا تو پاسبانِ حرم ہونے کی وجہ سے بھی احترام کیا جاتا تھا۔ دوسرے قافلے یا تو قریشِ مکہ کے اثر سے فائدہ اٹھاتے یا اپنی حفاظت کا

سامان خود ساتھ لے کر چلتے تھے۔ غیر ملکی قافلوں کو بحفاظت گزارنے کے عوض ان سے ٹیکس بھی لیا جاتا تھا۔

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ۔

(سورہ قریش ۱۰۶)

اس واسطے کہ مانوس رکھا قریش کو، مانوس رکھنا ان کے سفر سے جاڑے میں اور گرمی میں۔ تو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی بندگی کریں۔ جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف سے امن بخشا۔

ہوتا یہ تھا کہ مکہ میں ہر طبقے کے لوگ اپنا فروختنی سامان اس قافلہ کے حوالے کر دیتے، جسے وہ اچھے داموں بیچ کر ادھر سے سامان خرید لاتے تھے۔ اس طرح دوہری تجارت سے انہیں دُگنا منافع حاصل ہوتا جو بسا اوقات ۱۰۰ فیصد تک پہنچ جاتا تھا۔ اہل مکہ کی خوشحالی کا دارومدار اس قافلے کی کامیابی پر منحصر ہوتا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بعثت سے پہلے مدینہ، بصرہ اور شام کے متعدد تجارتی سفر کئے تھے۔

یہ قافلے کتنے بڑے ہوتے تھے؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابوسفیان کا وہ قافلۂ تجارت ـــ جو جنگِ بدر کا پیش خیمہ ثابت ہوا ـــ دوہزار باربردار اونٹوں پر مشتمل تھا۔ کئی مؤرخوں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ درآمد برآمد کی کل تجارت ۵۰ لاکھ دینار سالانہ تک ہوتی تھی۔ دینار سونے کا ایک سکہ ہے جو ۴½ ماشہ[1] کے برابر ہے۔ گویا محتاط اندازہ کے مطابق بھی اگر دینار کی قیمت ۶۰۰/- تصور کر لی جائے تو گویا یہ تجارت ۳ ارب روپے سالانہ تک جا پہنچتی تھی۔

پھر یہ تجارتی قافلے صرف قریشی تک ہی محدود نہ تھے۔ یمنی تاجر مکہ اور مدینہ کے راستے شام تک جاتے تھے۔ مدینے کے یہودی ـــ جو ایک سرمایہ دار قوم تھی۔ شام سے گندم اور شراب درآمد کرتے تھے جس میں غیر ملکی جنس کی مسلسل کھپت رہتی تھی۔ ملک میں کئی جگہ بازار اور منڈیاں لگتی تھیں، جہاں لوگ خرید و فروخت کے لیے جمع ہوتے تھے۔ سوداگروں کے قافلے ایران یا عراق سے تجارتی سامان لے کر آتے اور یمن کی پیداوار اپنے ممالک میں لے جاتے۔ اس طرح یمن سے بحرِ ہند کے راستے ہندوستان سے عراق کے راستے سے مشرقی ممالک اور شام و مصر کے راستے سے افریقہ سے تجارت ہوتی تھی۔ گویا عرب مشرق و

---

[1] زکوٰۃ کے لیے سونے کا نصاب ۲۰ دینار ہے، جسے علماء نے پوری تحقیق کے بعد ۷½ تولے سونا قرار دیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی ایک دینار کی قیمت ۴½ ماشے سونے کے برابر ہے۔ اگر ۱۶۰ روپے سونے کا بھاؤ فرض

مغرب بین بین الاقوامی منڈی بن گیا تھا۔ جس میں شہر مکہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

پھر احادیث میں تجارت کی جن اقسام کا ذکر ملتا ہے۔ اور جن میں سے بیشتر آج بھی رائج ہیں۔ ان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے۔ کہ ان ایام میں عرب میں تجارت کا کاروبار عروج پر تھا۔ اور تجارت کے سلسلہ میں جو ہدایات اور احکام مسلمان کو دیئے گئے ہیں وہ آج بھی مشعل راہ کا کام دیتے ہیں۔ اور تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے۔ کہ متعدد صحابہ کرام رضہ کی ہی تجارت کی وجہ سے اس دور میں بھی لکھ پتی بن گئے تھے۔

اندریں حالات یہ مفروضہ ــــ کہ عہدِ نبوی میں تجارت نہایت پُرخطر تھی لہٰذا برائے نام رہ گئی تھی۔ ایسا بے معنی مفروضہ ہے جس کی نہ تاریخ تائید کرتی ہے اور نہ ہی قرآن کریم۔

۲۔ تجارتی قرضے اور تجارتی سُود

اس بحث کو ہم تین حصّوں میں تقسیم کریں گے :۔

۱۔ عہدِ نبوی میں اندرونِ عرب تجارتی قرضوں اور تجارتی سود کا وجود

۲۔ عہدِ نبوی میں ہمسایہ ممالک میں تجارتی قرضے اور سود

۳۔ آیا ربا کا لفظ قرآن کریم یا لغوی اعتبار سے تجارتی سود کا بھی احاطہ کرتا ہے یا نہیں؟

۱۔ عرب میں تجارتی سُود

عہدِ نبوی میں تجارتی قرضوں پر سُود دینے کا رواج موجود تھا۔ جس کا ذکر تفاسیر میں ملتا ہے۔ صاحب تفسیر خازن آیت وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا (۲/۲۷۸) کے تحت لکھتے ہیں۔

حضرت عباس رضہ اور خالد بن ولید رضہ نے زمانہ جاہلیت میں شراکت کی تھی اور سودی کاروبار کرتے تھے۔ وہ قبیلہ بنو عمیر (جو قبیلہ ثقیف (طائف) سے تعلق رکھتا تھا) کے لوگوں کو کاروبار کے لیے سودی قرض دیتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ان کی بہت بڑی رقم واجب الوصول تھی جو انھوں نے چھوڑ دی۔ اور اس بات کا اعلان خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں ان الفاظ میں فرمایا :۔

"جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے ان خاندان کا سود یعنی عباس بن عبد المطلب کا سُود باطل کرتا ہوں۔" (بہت سی کتب احادیث)

یہ واضح رہے۔ کہ آیت بالا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف چار ماہ بیشتر نازل ہوئی تھی۔ گویا اس آیت کے نزول اور حجۃ الوداع کا زمانہ تقریباً ایک ہی تھا۔

جلیل القدر مفسر علامہ ابن جریر طبری (متوفی سنہ ۳۱۰ھ) اس آیت کی تفسیر میں یوں رقمطراز ہیں :۔

كَانَ رِبًا يَتَبَايَعُوْنَ بِهٖ فِي الْجَاهِلِيَّةِ۔ یہ وہ سُود تھا جس کے ساتھ جاہلیت میں لوگ خرید و فروخت کرتے تھے۔

۲۔ ہمسایہ ممالک میں تجارتی قرضے اور سُود

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل قریب زمانے میں قیصرِ روم جسٹینین نے جس کی وفات حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے صرف پانچ سال قبل ہوئی تھی۔ تمام بازنطینی سلطنت میں از روئے قانون زمینداروں اور کاشتکاروں کے قرضوں پر ۴ فیصد تجارتی اور صنعتی قرضوں پر ۸ فیصد اور بحری تجارت کے قرضوں پر ۱۲ فیصد شرح سود مقرر کی تھی۔ یہ قانون جسٹینین کے بعد بھی ایک مدت تک بازنطینی سلطنت میں رائج رہا۔[ا]

روم کی سلطنت عرب کی ہمسایہ مملکت تھی۔ جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا ہے۔ یہاں تجارتی سُود اپنی تمام شکلوں میں رائج تھا۔ اسی طرح دیگر ممالک میں بھی تجارتی سود کے شواہد مل جاتے ہیں جو بوجہ طوالت چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ یہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ آس پاس کے ملکوں سے اہلِ عرب کے گہرے تجارتی روابط اور میل جول تھا۔ اندریں حالات یہ تصور کرنا ناممکن ہے کہ اہلِ عرب تجارتی سود سے ناواقف ہوں۔

اگر ہم بفرضِ محال تجارتی سُود کے حامیوں کے خیال کے مطابق یہ فرض کر بھی لیں کہ اہلِ عرب اس دور میں تجارتی سُود سے ناآشنا تھے۔ تو بھی اس سے سُود کی اباحت کے متعلق کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ ایک طرف تو ہم یہ دعوے کرتے ہیں کہ اسلام کے احکام ابدی اور تمام دنیا کے لیے ہیں، دوسری طرف ہم صرف عرب کے ایک مخصوص دور پر نظر رکھ کر سُود کے احکام کو صرف اس دور اور اس علاقے تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا (معاذ اللہ) اللہ تعالےٰ کو اتنا بھی علم نہ تھا کہ اگر عرب میں نہیں تو ہمسایہ ملک میں کس کس قسم کا سود رائج ہے یا آئندہ کیا کچھ ہونے والا ہے؟ کیا یہی علم و حکمتِ خداوندی ہے؟ سُود کے یہ بالاطلاق خدائی احکام اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سود کی تمام مشتبہہ شکلوں سے پرہیز کو لازم قرار دینا کیا اس بات کی واضح دلیل نہیں کہ سود کی کوئی بھی

[ا] "سود" از مولانا مودودی صاحب ص ۲۸ بحوالہ:

(CIVILISATION(1) A.S. Lowood ازوِل ڈرافٹ ج ۴ ص ۱۲۰، ۳۲۶ م

شکل کسی بھی دور میں حلال قرار نہیں دی جا سکتی؟

۳۔ تجارتی سود کی حرمت قرآن کریم سے

اسلام نے تجارتی اور شخصی قرضوں میں کوئی فرق روا نہیں رکھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ضرور اس کی وضاحت کردی جاتی۔ اس کی نگاہ میں اصل سے ایک مقررہ شرح کے مطابق جو کچھ بھی زائد لیا جائے اور جس طرح بھی لیا جائے وہ "ربا" ہی ہے۔ ربا کے لغوی معنی بھی اس مخصوص اضافے کے ہیں جو اصل سے زائد لیا جاتا ہے۔ اور شخصی اور تجارتی قرضوں میں فرق کرنا گویا:-

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ (۲/۸۵)
کیا تم کتاب کے کچھ حصے پر تو ایمان لاتے ہو اور کچھ کا انکار کر دیتے ہو۔

کے مترادف ہے۔ ربا کو مہاجنی قرضے سے مختص کرنا اور سود کا الگ الگ مفہوم مقرر کرنا موجودہ دور کا اختراع ہے۔ جس کا مسلمانوں کی طویل تاریخ میں کہیں سراغ نہیں ملتا۔

تجارتی سود کے متعلق الگ احکام یا الگ لعنت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اسلام تجارتی قرضوں اور سود کی الگ نوعیت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ سود کے احکام ہر قسم قرضوں پر منطبق ہوتے ہیں۔ ان احکامات میں جہاں شخصی حاجات کے سود کی حرمت کا پتہ چلتا ہے وہاں تجارتی سود کی حرمت پر بھی واضح دلائل موجود ہیں۔ مثلاً

پہلی دلیل:- خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا (۲/۲۷۵)
اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

یہاں خرید و فروخت یا تجارت کے مقابلے میں لفظ "ربا" کا استعمال تجارتی سود کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ جہاں شخصی حاجات کے قرضوں کا ذکر مقصود تھا وہاں قرآن کریم نے ربا کے مقابلے میں صدقہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

ارشادِ باری ہے:-

يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ (۲/۲۷۶)
اللہ تعالیٰ سود کو ختم کرتا اور صدقات کی پرورش کرتا ہے۔

دوسری دلیل:- قرآن کریم کے اس ارشاد:-

وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ (۲/۲۷۹)
پھر اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لیے تمہارے راس المال ہیں

کیونکہ راس المال (جس کا معنی سرمایہ ہے) کا اطلاق عموماً تجارت پر لگائی ہوئی رقم کے لیے ہوتا ہے۔

تیسری دلیل:۔ قرض کے لیے عربی لغت میں دو الفاظ ملتے ہیں۔ قرض اور دَین۔ قرض کا مفہوم عام فہم ہے اور عام طور پر شخصی قرضوں کے لیے آتا ہے۔

ارشادِ نبویؐ ہے :۔

إِذَا أَقْرَضَ الرَّجُلُ فَلَا يَأْخُذْ هَدِيَّةً ۔ (بخاری)	جب کوئی شخص کسی دوسرے آدمی کو قرض دے تو پھر اس سے ہدیہ قبول نہ کرے۔

جبکہ دَین کا لفظ ہر قسم کے لین دین پر محیط ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ ذمہ داری یا انگریزی میں LIABILITY (ادائیگی کی ذمہ داری) ہوگا۔ جس میں کاروباری قرضے بھی شامل ہوتے ہیں۔

ارشادِ باری ہے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ (۲/۲۸۲)	اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک مقررہ وقت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

اور ربا کی تعریف "الزیادۃ فی الدین" سے کی جاتی ہے نہ کہ "الزیادۃ فی القرض" سے لہذا ازروئے قرآن و لغت بھی تجارتی سود کو "ربا" سے خارج کرنے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

۳۔ شرحِ سود میں کمی تجارتی سود کی حمایت میں یہ دلیل کہ اس کی شرح نقصان کے احتمال کو مدنظر رکھ کر مناسب اور قابلِ برداشت مقرر کی جاتی ہے کئی لحاظ سے محلِ نظر ہے :۔

اولاً یہ کہ آج تک مناسب اور معقول شرحِ سود کا تعین نہیں ہو سکا۔ کبھی تو یہ شرح ۲ فیصد بھی نامناسب اور غیر معقول قرار دی جاتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جنگِ عظیم کے لگ بھگ زمانے ریزرو بنک آف انڈیا ڈسکونٹ ریٹ مقرر ہوا اور یہی شرح دورانِ جنگ قائم رہی۔ پھر پونے تین فیصد پر حکومت ہند کو قرضے ملتے رہے۔ اور کبھی یہ شرح ۹ فیصد بھی مناسب اور معقول سمجھ لی جاتی ہے۔ (اشتہار انویسٹمنٹ بنک نوائے وقت ۴/۱۱) شرحِ سود کی مناسب تعیین نہ ہو سکنے کی غالباً وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد ہی تزلزل اور کمزور ہے۔ مناسب اور معقول شرحِ سود کی تعیین تو صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے۔ جب یہ معلوم ہو سکے کہ قرض لینے والا اس رقم سے کتنا یقینی فائدہ حاصل کرے

یہ معلوم ہو سکے کہ قرض لینے والے کو اس مقررہ مدت میں کتنا سو گا یا کچھ فائدہ ہو گا بھی یا نہیں ؟ تو پھر معقول شرح سود کا تعین کیسے ممکن ہے۔ بلکہ اس سے بھی ذرا آگے بڑھیں اور شرح سود کے بجائے نفس سود اور اس کے جواز پر غور کریں کہ سود آخر کس چیز کا معاوضہ ہے۔ تو اس اہم مسئلہ پر معیشت دانوں کے جتنے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ شاید ہی علم معاشیات کے دوسرے مسئلے پر پائے جاتے ہوں۔

ثانیاً یہ کہ ایک ہی ملک اور ایک ہی وقت بینکوں کی شرح سود میں انتہائی تفاوت پایا جاتا ہے۔ مثلاً آج کل پاکستان کے سٹیٹ بنک نے عام بنکوں کو قرض دینے کی شرح ۱۰ فیصد مقرر کر رکھی ہے۔ اب عام بنک کاروباری حضرات کو ۱۴٪ شرح پر قرض دیتے ہیں۔* پھر حکومت خود عوام سے کاروبار کے لیے جو قرضے لیتی ہے تو یہ شرح دس سال کے قرض کے لیے ۲۹ فیصد ہے۔ اور رقم دس سال میں چار گنا ہو جاتی ہے۔ اب آپ خود اندازہ کیجئے کہ اگر یہ سب کچھ مناسب شرح ہے تو نامناسب کیا ہو سکتی ہے؟ اور اگر ایسے قرض لے کر تجارت کی جائے جہاں نقصان کے احتمال بھی موجود ہیں۔ تو گرانئ اشیاء کا کیا عالم ہو گا۔

ثالثاً یہ بات قابل غور ہے۔ کہ اگر بفرض شرح سود مناسب حد تک کم اور معقول ہو تو کیا حرمتِ سود پر اثر انداز ہو بھی سکتی ہے یا نہیں ؟ اور حقیقتاً یہی اصل بحث ہے۔ تو ہمارے خیال میں شرح سود ایک فیصد ہو یا ۵۰ فیصد شریعت کی نگاہ میں یکساں جرم ہے۔ شراب ایک قطرہ بھی ویسے ہی حرام ہے۔ جیسے ایک چھلکتا جام۔ کیونکہ شریعت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ :۔

> "حرام چیز کی قلیل ترین مقدار بھی ویسے ہی حرام ہے جیسے اس کی کثیر مقدار۔ لہٰذا شرح سود کی کمی یا معقولیت کی بنا پر سود کی اباحت کے لیے راستہ ہموار کرنا بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔"

۴۔ فریقین کی رضامندی

فریقین کی رضامندی کی شرط حلال چیزوں میں ہوا کرتی ہے جیسے تجارت یا نکاح وغیرہ۔ حرام چیزوں اور معاہدات میں فریقین کی رضامندی کی شرط ہی سرے سے غلط اور باطل ہے۔ فریقین کی رضامندی زنا یا جوئے کو جائز نہیں بنا سکتی۔ حالانکہ یہ دونوں کام بھی بسا اوقات باہمی رضامندی ہی سے طے پاتے ہیں۔ پھر آخر سود جیسی حرام اور مکروہ چیز کو دوسروں کی مرضی یا فریقین کی رضامندی پر کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔ اسی طرح خواہ سود لینے والا شرح سود کی تعین کرے یا سود دینے والا اس سے بھی نفس سود کی حرمت

* جو سود اور سود کے چکر میں ۱۸ فیصد سالانہ اور بعض حالتوں میں اس سے بھی زیادہ بن جاتی ہے۔ یہ نامناسب شرح سود ہے۔

میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ سُود دینے والا کبھی سُود دینے پر رضامند نہیں ہوا کرتا۔ اس کی رضامندی نہیں ہوتی بلکہ اضطرار ہوتا ہے اگر اسے کم شرح سود پر قرضہ مہیا ہو سکے یا کہیں سے قرضِ حسنہ ملنے کی توقع ہو تو وہ کبھی یہ سودی قرض لینے پر تیار نہ ہوگا۔ سودی معاہدات میں رضامندی کا جتنا پہلو ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل تاریخی واقعہ سے بخوبی ہو سکے گا۔

دوسری جنگِ عظیم کی بات ہے کہ انگلستان نے امریکہ سے ایک بھاری قرض کا معاملہ کیا جو (BRITTONWOOD AGREEMENT) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ معاہدہ مشہور ماہر معاشیات برطانیہ لارڈ کینز (KEENS) کی معرفت طے پایا تھا۔ انگلستان یہ چاہتا تھا کہ اس کا خوشحال دوست ملک امریکہ، جو اس لڑائی میں اس کا رفیق تھا اُسے بلا سُود قرض دے دے۔ لیکن امریکہ سُود چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔ انگلستان اپنی مشکلات کی وجہ سے مجبور ہو گیا کہ سود دینا قبول کرے۔ اس کا جو اثر انگریز قوم پر مرتب ہوا وہ بھی سُن لیجئے :۔

لارڈ کینز جنھوں نے انگلستان کی طرف سے یہ معاہدہ کیا تھا، جب اپنے مشن کو پورا کر کے پلٹے تو اُنھوں نے برطانوی دارالامرا میں تقریر کرتے ہوئے کہا "میں تمام عمر اس رنج کو نہ بھولوں گا جو مجھے اس بات سے ہوا کہ امریکہ نے ہم کو بلاسود قرض دینا گوارا نہ کیا۔"

مسٹر چرچل جیسے زبردست امریکہ پسند شخص نے کہا کہ "یہ بنیئے پن کا برتاؤ جو ہمارے ساتھ ہوا ہے۔ مجھے اس کی گہرائی میں بڑے خطرات نظر آتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے باہمی تعلقات پر بہت ہی برا اثر پڑا ہے۔"

اس وقت کے وزیر خزانہ ڈاکٹر ڈالٹن نے کہا کہ "یہ بھاری بوجھ جسے لادے ہوئے ہم جنگ سے نکل رہے ہیں ہماری ان قربانیوں اور جفاکشیوں کا بڑا ہی عجیب صلہ ہے جو ہم نے مشترک مقاصد کے لیے برداشت کیں۔"

اب بنک کے سود کی طرف آئیے اور غور فرمائیے کہ جو لوگ بنک سے سودی قرضے حاصل کرتے ہیں تو کیا انہیں باہمی رضامندی کا نام دینا مناسب ہے، یا اضطراری معاہدے کا۔ اور ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ ایسے بیشتر معاہدے اسی اضطراری نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو بنک میں سُود کے لالچ سے روپیہ جمع کراتے ہیں، ان کی کیفیت اضطراری نہ سہی وہ تو سود کے معاشی اور معاشرتی نقصانات

م م گر نہ د ا ک د ت

یہ تو خیر ایک ضمنی سی بحث تھی کہ سودی معاملات میں صرف رضامندی کا نہیں بلکہ اضطرار کا پہلو بھی شامل ہے۔ تاہم اس پہلو کو نظرانداز کر کے اگر فریقین کی رضامندی بھی تسلیم کر لیا جائے۔ تو بھی سود کی حرمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔

۵۔ ربا اور ظلم

تجارتی سود کی حمایت میں یہ دلیل بڑے شد و مد سے پیش کی جاتی ہے کہ یہ معاہدات چونکہ نہایت معقول شرح پر باہمی رضامندی سے طے پاتے ہیں۔ اور ان میں کسی فریق پر ظلم بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرآن کریم کے الفاظ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ کے مطابق یہ سود اس ربا میں کیسے آسکتا ہے۔ جس کی بنیاد ظلم پر ہوتی ہے۔ گویا حرمت سود کی علت ظلم سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ظلم سود کی حرمت کا بنیادی سبب نہیں ہے۔ آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہے۔ کہ یہ الفاظ سودی معاملات اور معاہدات کو ختم کرنے کی ایک احسن صورت پیش کرتے ہیں۔ یعنی نہ تو مقروض قرض خواہ کی اصل رقم بھی دبا کر اس پر ظلم کرے اور قرض خواہ مقروض کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اصل کے علاوہ اس پر سود کا بوجھ لاد دے۔ ان الفاظ کا اطلاق ہمارے ہاں اس وقت ہوگا۔ جب ہم معاشرہ سے سود کو ختم کریں گے۔

سود کی حرمت کا بنیادی سبب ظلم نہیں۔ بلکہ بیٹھے بٹھائے اپنے مال میں اضافہ کی وہ ہوس ہے جس سے ایک سرمایہ دار اپنی فاضل دولت میں طے شدہ منافع کی ضمانت سے یقینی اضافہ چاہتا ہے۔ اور جس سے زرپرستی، تنگ دلی اور شقاوت جیسے اخلاق رذیلہ جنم لیتے ہیں۔ سود کے متعلق سب سے پہلی آیت جو مکی دور میں نازل ہوئی اس میں اسی بنیادی سبب کی پوری وضاحت ملتی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَمَا آتَيْتُم مِّن رِّبًا لِّيَرْبُوَ فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُو عِندَ اللَّهِ۔ (۳۰-۲۹)	اور جو رقم تم سود پر دیتے ہو تاکہ وہ لوگوں کے مال سے بڑھے تو یہ مال اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا۔

سرمایہ دار جب اپنی فاضل رقم سود کی راہ میں ڈال دیتا ہے۔ تو وہ رقم لوگوں کے گھروں میں پہنچ پہنچ کر ان کی دولت بھی سرمایہ دار کے ہاں پہنچا دیتی ہے سرمایہ دار اور ساہوکار پہلے سے زیادہ سرمایہ دار بن جاتے ہیں۔ اور نادار اور ضرورت مند لوگ غریب سے غریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح دولت کی تقسیم کی ناہمواری بڑھ جاتی ہے، جو طبقاتی تقسیم معاشرہ کے بگاڑ کا سبب بنتی ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ یہ چیز بالآخر معاشرے میں بگاڑ اور تباہی کا سبب بنے گی۔